۲۲؍ جولائی ۱۹۷۰ء

ہفتہ وار

ہماری زبان

جلد ۲۹ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | شمارہ ۲۸

اس شمارے میں

آل احمد سرور

میں نے امریکہ کو کیسا پایا؟

(۷)

تشدد امریکہ کی زندگی میں خاصی اہم روایت رہا ہے۔ امریکہ کی آبادی اور ترقی میں شروع سے تشدد کے بڑے پیمانے پر استعمال کی مثالیں ملتی ہیں۔ جو لوگ سب سے پہلے یہاں آکر بسے انھوں نے امریکہ کے پرانے باشندوں ریڈ انڈین قبائل کے ساتھ بڑی بے رحمی کا برتاؤ کیا اور ان کے علاقوں سے انھیں مار کر نکال دیا۔ پھر یورپ سے جو لوگ آئے تھے وہ بھی سب شرفا کے گروہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے ان میں ایسے لوگ بہت تھے جو ڈنڈے کے زور سے اپنا کام نکالنا جانتے تھے۔ وسطی اور مغربی امریکہ کے وسیع علاقوں کے جنگلوں، گھاس کے میدانوں ریگستانوں، پہاڑوں کی تسخیر کچھ اس طرح ہوئی کہ رفتہ رفتہ (WESTERNS) کے نام سے ایسے ناولوں اور فلموں کا ایک انبار لگ گیا جن میں تشدد، خونریزی، بہادری، سرفروشی کی داستانیں بیان کی جاتی ہیں۔ پھر امریکہ نے انفرادی آزادی پر شروع سے زور دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب رابرٹ کنیڈی کے قتل پر سارے ملک میں غم و غصے کی لہر دوڑی اور اخباروں اور ٹی۔ وی پر اسلحہ کی خریدنے کی عام چھوٹ پر پابندی لگانے کی مہم شروع ہوئی تو بالآخر اس انفرادی آزادی کے نام پر مگر دراصل بعض اسلحہ کے تاجروں کے کاروبار کو بچانے کے لئے اس مہم کی مخالفت کی گئی۔ اس وقت امریکہ کے دانشور تشدد کے مسئلے پر بڑے زور شور سے بحث کر رہے ہیں۔ نیویارک ریویو آف بکس میں مشہور دانشور ہینا آرنٹ (HANNAH ARENDT) نے ایک طویل مضمون لکھا تھا جو ایک خاص ضمیمے کے طور پر شایع ہوا تھا۔ اس میں اس مشہور مصنف نے ایک دلچسپ بات یہ کہی تھی کہ جیسے جیسے ایٹمی طاقت بڑھتی جاتی ہے۔ عالمی جنگ کے لئے خود بخود ایک پابندی وجود میں آتی جاتی ہے کیونکہ سب کی تباہی یقینی ہے مگر بین الاقوامی پیمانے پر تشدد کے استعمال میں وقت ملک کے اندرونی معاملات میں تشدد کے استعمال کو تقویت دیتی ہے۔ اسی طرح اصلاحی کوششیں مثلاً کالے گورے کی تفریق یا طلبہ کی یونیورسٹی کے نظام کو بدلنے کی جد و جہد دراصل اس لئے جارحانہ ہوتی ہیں کہ اس کے بغیر اصلاح کی صورت نہیں نکلتی اور لوگ اصلاح کی ضرورت کے قائل نہیں ہوتے۔ گویا یہ تشدد برائے تشدد نہیں ہے تشدد کا ایک خاص استعمال ہے۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ جب بڑے پیمانے پر ایک ایسا دفتری نظام وجود میں آجاتا ہے جس کے شکنجے میں عام آدمی گرفتار ہوتا ہے، جب آدمی کا سابقہ آدمیوں سے نہیں صرف مشینوں یا دفتروں سے ہوتا ہے تو تشدد کو دو بڑھاوا ملتا ہے اور امریکہ میں طلبہ کی موجودہ شورش یا دو سال پہلے فرانس میں طلبہ کی شورش، دراصل اسی دفتری اور

اشاعت کی تاریخیں
۱، ۸، ۱۵، ۲۲

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

فی کاپی: ۱۵ پیسے
قیمت سالانہ: ۵ روپے

صنعتی نظام کے خلاف بغاوت کا ایک مظہر کہی جا سکتی ہیں بعض دوسرے دانش ور صنعتی نظام یا ٹیکنالوجی کو اس کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ نارمن برن بام (NORMAN BIRN BAUM) صنعتی سماج کے بحران (THE CRISIS K OF INDUSTRIAL SOCIETY) میں کہتا ہے کہ صنعتی نظام ایک نئے دانشور طبقے (ELITE) کو جنم دیتا ہے جو اپنی حکومت باقی رکھنے کے لئے خاصی سختی کرتا ہے۔ اس کے نزدیک پبلک سیکٹر اور پرائیویٹ سیکٹر دونوں کے افراد اس معاملے میں ایک سے ہوتے ہیں۔ اس لئے صنعتی نظام سماج میں تشدد کو بالآخر ہوا دیتا ہے۔ امریکہ کے کچھ ماہرین نفسیات انسان کی فطرت میں تخریبی پہلو پر زور دیتے ہیں گو یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کو ایک اور رُخ دیا جا سکتا ہے جس کے ذریعہ سے بجائے لوگوں کو ہلاک کرنے کے پرانے اور فرسودہ نظام کو ختم کر کے ایک زیادہ متوازن سماج کے لئے راستہ ہموار کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال بڑے اور طاقت ور ملک۔ بڑے شہر۔ بڑے وسائل، فطرت کے ایک جائزے کے تحت ایک منزل پر تشدد کو ضرور تقویت دیتے ہیں۔ یہ تشدد عام طور پر طاقت حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے، مگر خود بھی ایک مستقل کشش رکھتا ہے۔ اس لئے یہ بھی کہا گیا ہے کہ چھوٹے چھوٹے ملکوں میں تشدد کا مقابلہ آسان ہے اور بالآخر دنیا شاید بڑی طاقتوں، بڑے ملکوں، بڑے اور پیچیدہ مشینی اداروں کے مقابلے میں چھوٹے چھوٹے ملکوں، نسبتاً سادہ اداروں اور براہ راست انسانی تعلقات میں نجات کا راستہ ڈھونڈے گی۔
بہرحال اس وقت تو امریکہ میں تشدد ایک حقیقت ہے اور یہ تشدد صرف اس طبقے کی طرف سے نہیں ہوتا جو مظلوم یا ستم رسیدہ ہے، بلکہ اس کی جارحیت کے مقابلے میں برسر اقتدار طبقے کا تشدد جو کسی وقت بڑے پیمانے پر سامنے آ سکتا ہے اور حکومت کے سارے وسائل استعمال کر سکتا ہے۔ زیادہ خطرناک ہے۔ ان مسائل کا عرفان ہی میرے نزدیک بے معنی اور بے راہ تشدد کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو کم کر سکتا ہے۔ اس لئے امریکی دانش وروں میں سماجی نظام کی خرابیوں کو دور کرنے، شہروں کی فضا کو بہتر بنانے، ویت نام کی لڑائی سے دست بردار ہونے اور کالے گورے کی تفریق کو ختم کرنے کا جذبہ شاید امریکہ میں بڑھتے ہوئے تشدد کو خود بخود قابو میں لانے کی صورت نکال دے۔

(باقی)

رسالہ تحریر کے دو نمبر

علمی مجلس، دلی کا علمی و تحقیقی سہ ماہی رسالہ "تحریر" کے نام سے گزشتہ چار سال سے مسلسل مالک رام صاحب کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ اس کے سال رواں کے دو شمارے یکے بعد دیگرے شائع ہوئے ہیں۔

پہلے شمارے (نمبر ۱۱) میں یہ مضامین ہیں: ۔ نسبی اور تقویم ہجری (پروفیسر محمد اللہ، پیرس)، غالب صدی تقریبات کا جائزہ (پروفیسر اسلوب احمد انصاری، علی گڑھ)، اردو رسالوں کے غالب نمبر (عبداللطیف اعظمی، جامعہ نگر)، قانون ابن سینا اور اس کی شرحیں (حکیم ظل الرحمٰن، طبیہ کالج دہلی) آخر میں خود مالک رام صاحب نے وفیات کے عنوان سے رئیس احمد جعفری، انتظام اللہ شہابی اور خورشید احمد جامی کے حالات لکھے ہیں۔

شمارہ (۱۲) جگر بریلوی نمبر ہے اس شمارے میں جو ۱۹۲ صفحات کی پوری کتاب ہے، جگر صاحب کی سوانح عمری اور فن سے متعلق ۱۳ مضمون ہیں۔ قیمت چھ روپے ہے۔

• نامہ نگار

اردو ہندی سنگم انعامات

آل انڈیا اردو ہندی سنگم کی انتخابی کمیٹی نے مشہور شاعر کرشن موہن کے مجموعۂ کلام 'دلِ نادان' کو ۱۹۷۰-۷۱ء کے نظم انعام کے لئے منتخب کر لیا ہے۔

اس کمیٹی نے خواجہ عبدالغفور کی کتاب قہقہہ زار کو بھی اس سال کے طنز و مزاح انعام کے لئے منتخب کیا ہے یہ انعامات اکتوبر میں منعقد ہونے والے ایک جشن میں تقسیم کئے جائیں گے۔

• نیشنل ہیرالڈ

فسادات اور اردو لائبریریاں

ہجوم شاہی کے اس دور میں توڑ پھوڑ کی سرگرمیاں ہماری زندگی کا ایک معمول بن گئی ہیں۔ ایسی حالت میں اردو لائبریریوں کی حفاظت کا کام ایک مسئلہ بن گیا ہے۔ اپنے طور پر ہم جو کر سکتے ہیں وہ یہ ہے۔

۱۔ لائبریریوں کو سیکولر بنانے کی کوشش کیجئے تاکہ وہ کسی خاص فرقہ کی نظر میں نہ کھٹکے۔

۲۔ مخطوطوں اور نایاب مطبوعات کی فوٹوسٹیٹ کاپیاں ملک کے اندر اور باہر کی بڑی بڑی لائبریریوں میں محفوظ کرائیے۔

• اقبال کرشن

ڈاکٹر سید محمد علی کاظمی

مولوی عبدالحق اور قاضی عبدالغفار

جس زمانے میں قاضی عبدالغفار حیدرآباد تشریف لے گئے اور وہاں مستقل سکونت اختیار کرنے کے بعد ایک اردو روزنامہ "پیام" کی اشاعت کا پروگرام بنایا تو اس زمانے میں مولوی عبدالحق مرحوم اورنگ آباد میں مقیم تھے اور اس وقت تک دونوں حضرات کے آپسی تعلقات خاصے خوشگوار تھے۔ اخبار پیام جاری کرنے کے سلسلے میں مولوی عبدالحق، قاضی صاحب کی جو کچھ مدد کرسکتے تھے انھوں نے وہ بھی کی۔ کچھ حضرات کا تو یہ بھی خیال ہے کہ مولوی صاحب نے اخبار کی اشاعت کا آغاز کرنے کے لئے فراہمی سرمایہ میں بھی قاضی عبدالغفار کی مدد کی تھی۔

قاضی صاحب کے اخبار "پیام" کے ایک اہم شریک کار سبط حسن نے حیدرآباد دکن کے اس زمانے کے حالات پر مبنی اپنی کتاب "شہر نگاراں" میں جو کچھ تحریر کیا ہے اس سے بھی اس امر کی پُر زور تائید ہوتی ہے کہ اس زمانے میں دونوں صاحبان کے تعلقات نہایت درجہ قریبی اور خوشگوار تھے اور مولوی عبدالحق نے اخبار "پیام" جاری کرنے کے سلسلے میں قاضی صاحب کی کافی مدد کی تھی۔ خود سبط حسن بھی مولوی عبدالحق ہی کے ایماء پر "پیام" میں کام کرنے کے لئے طلب کئے گئے تھے۔ اس سلسلے میں سبط حسن اپنی تصنیف شہر نگاراں میں رقم طراز ہیں:-

> "مئی ۱۹۳۵ء کی کوئی تاریخ تھی میں لکھنؤ میں مقیم تھا، کہ مولوی عبدالحق صاحب کا تار آیا کہ تم فوراً اورنگ آباد پہونچو۔ ...... اورنگ آباد پہونچ کر اختر حسین رائے پوری کی زبانی معلوم ہوا کہ مولوی صاحب مجھے حیدرآباد بھیجنا چاہتے ہیں۔ وہاں "پیام" نامی ایک اخبار قاضی عبدالغفار صاحب کی ادارت میں جاری ہوا ہے۔ مولوی صاحب اس کے سرپرست ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ میں اس میں کام کروں۔"[۱]

اس کے ساتھ ہی خود سبط حسن نے بھی دوسری جگہ لکھا ہے اور چند دوسری تحریریں بھی اس امر کی شاہد ہیں کہ کچھ مدت کے بعد قاضی صاحب اور مولوی عبدالحق مرحوم کے تعلقات نہ صرف یہ کہ باقی نہ رہے بلکہ کافی کشیدہ ہوگئے۔ اور نوبت خط و کتابت یا پیام و سلام کا سلسلہ بند ہونے تک ہی نہیں پہونچی بلکہ کھلے عام روزنامہ "پیام" اور پندرہ روزہ "ہماری زبان" کے صفحات پر معرکہ کارزار گرم ہوگیا اور مولوی عبدالحق مرحوم اپنے کسی مضمون میں اس حد تک پہونچ گئے کہ قاضی عبدالغفار مرحوم کو اپنے اخبار کے صفحات میں لکھنا پڑا کہ

> "معاصر ہماری زبان" نے مدیر پیام پر ادنیٰ قسم کے ذاتی حملے بھی جائز رکھے۔ ان اشارات کا ہم کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ ہمارے نقطۂ نظر سے یہ بالکل جدا بات ہے اور خدا نہ کرے کہ ہم کبھی ذاتی جذبات سے متاثر ہو کر کسی ایسی لغزش کا ارتکاب کریں۔"[۲]

افسوس کہ اس زمانے کے ہماری زبان کے شمارے دستیاب نہیں ہیں جو مولوی عبدالحق کی اس "لغزش" یا "ارتکاب" کا پتہ لگ سکتا کہ انھوں نے قاضی صاحب پر کس قسم کے حملے روا رکھے تھے! بہرحال کسی معتبر اور مستند ذریعہ سے اس بات کا علم نہیں ہوسکا کہ آخر اس رنجش اور کشیدگی پیدا ہونے کی اصل وجہ کیا تھی؟ خود سبط حسن بھی اپنی کتاب "شہر نگاراں" میں اس امر سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں اور صرف اتنا لکھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ

> "دوسری جنگ عظیم کا خونی آفتاب ڈھل رہا تھا کہ ایک دن قاضی صاحب کا خط آیا لکھا تھا کہ حیدرآباد میں اردو کانفرنس ہونے والی ہے۔ میں بمبئی کے ادیبوں اور صحافیوں کو دعوت نامے بھیج رہا ہوں تم ان لوگوں کو کانفرنس میں شرکت پر آمادہ کرو اور خود بھی ضرور آؤ۔ خط کے ہمراہ کانفرنس کا بہت مرعوب کن پروگرام بھی ملفوف تھا۔ .... مخدوم سے ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ اردو کانفرنس دراصل "انجمن ترقی اردو ہند" کے مقابلے پر بنائی گئی تھی اور نئے صدر اعظم نواب صاحب چھتاری اس کی پشت پر تھے۔ دراصل وہ رنجش اب رنگ لارہی تھی جو نہ جانے کس وجہ سے مولوی عبدالحق صاحب اور قاضی صاحب کے درمیان پیدا ہوگئی تھی۔"[۳]

سبط حسن ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

> "ان دنوں قاضی صاحب اور مولوی صاحب میں بول چال بند تھی لیکن قاضی صاحب نے مجھے کبھی مولوی صاحب سے ملنے یا ان سے خط و کتابت کرنے سے نہ روکا۔ بلکہ جب میں مولوی صاحب سے مل کر آتا تھا تو مجھ سے ان کی خیریت ضرور پوچھتے تھے۔ اس وقت ان کے چہرہ پر کرب کی کیفیت ہوتی تھی گویا دل ہی دل میں اس شکر رنجی پر افسوس کررہے ہوں۔"[۴]

جہاں تک "کل ہند اردو کانفرنس" اور قاضی عبدالغفار کا اس

---

۱ شہر نگاراں۔ صفحہ ۸ مرتبہ سبط حسن دسمبر ۱۹۶۶ء

۲ اداریہ روزنامہ "پیام" حیدرآباد دکن مورخہ ۵ جون ۱۹۴۳ء

۳ شہر نگاراں ص۶۳ مرتبہ سبط حسن دسمبر ۱۹۶۶ء

۴ " ص۱۳۴ " " "

میں دلچسپی لینے کا حق ہے اس سلسلے میں سید حسن کے مذکورہ بیان کے ساتھ ساتھ اگر ڈاکٹر محی الدین قادری زور مرحوم کا یہ بیان بھی پیش کر دیا جائے تو دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جس میں زور مرحوم نے لکھا ہے کہ

"۱۹۴۴ء میں جب ادارے نے کل ہند اردو کانفرنس کے انعقاد کے لئے اعلیٰ پیمانے پر انتظامات شروع کئے تو قاضی صاحب نے ادارے کے ساتھ نہ صرف تعاون کیا بلکہ ارباب ادارہ کے دوش بدوش مولوی عبدالحق صاحب اور ان کے بعض ساتھیوں کا جو کسی غلط فہمی کی وجہ سے اس کانفرنس کے مخالف تھے اور اس کو ناکام کرنا چاہتے تھے اس طرح مقابلہ کیا کہ مولوی صاحب یہ سمجھنے لگے تھے کہ یہ سلسلہ اتما شا قاضی صاحب ہی کا کھیلا ہوا ہے ...... حالانکہ اس اردو کانفرنس کے انتظامات میں قاضی صاحب بہت کم کوشاں ہوئے تھے اور محض اپنی آزاد خیالی اور دوستی کی بنا پر اس کے کارکنوں کی تائید کر رہے تھے۔"[1]

قاضی صاحب کی آزاد خیالی اور دوست داری اپنی جگہ مسلّم لیکن زور مرحوم کا یہ فرمانا کہ قاضی صاحب نے مولوی صاحب سے اپنی کسی ذاتی عناد یا انجمن ترقی اردو ہند کی مخالفت کی بنا پر اردو کانفرنس کے ساتھ تعاون نہیں کیا تھا، محل نظر ہے۔

قاضی عبدالغفار مرحوم اور مولوی عبدالحق مرحوم کے باہمی تعلقات کی اس کشیدگی کے سلسلے میں صرف زبانی ہی نہیں بلکہ تحریری شواہد بھی کافی ملتے ہیں۔ حیدرآباد کے ایک بزرگ کا فرمانا ہے کہ قاضی صاحب نے مولوی عبدالحق کو دکن کی سرزمین سے اکھاڑنے کے لئے ملکی اور غیر ملکی کا حربہ بھی استعمال کیا تھا۔ یہ کشیدگی برابر قائم رہی اس سلسلے میں چند تحریری اقتباسات اور پیش کئے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر قاضی صاحب اپنے ایک مضمون "ہندوستانی زبان کا مسئلہ" میں مولوی عبدالحق کی لسانی پالیسی کا ذکر ان تلخ الفاظ میں کرتے ہیں :-

"بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب مع اپنے ساز و سامان کے پاکستان تشریف لے جانے والے ہیں ...... زندگی کے دوسرے شعبوں میں قائداعظم کی سیاست کے جو زہریلے تحفے ہمیں حاصل ہوئے دیا ہی ایک تحفہ زبان کے مسئلہ میں "بابائے اردو" ہمارے لئے چھوڑ جانے والے ہیں۔"[2]

اس کے علاوہ انجمن ترقی اردو ہند کے سکریٹری نامزد ہونے پر قاضی عبدالغفار نے انجمن کی پہلی رپورٹ مئی ۱۹۵۰ء تا اگست ۱۹۵۱ء مرتب کی جس میں انجمن کی گزشتہ تاریخ پر بھی مختصراً روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس رپورٹ میں چند امور کا ذکر اور کچھ خدمات کا اعتراف خاصے نمایاں انداز میں کیا گیا ہے مثلاً ریاست حیدرآباد دکن سے انجمن کو جو امداد ملتی تھی یا ۱۹۴۴ء کے زرِ دوامانہ

حرمت الاکرام

غزل

تن جھیلے پاتال کی بپتا من جھوے بہاروں میں
یونہی اعانہ کرتے چلو نگر دن کے شہباروں میں

وجہ نہ پوچھو اتنا سمجھو، یہ بھی ہے اک اچھا خیال
جی چاہے ہے، تھوڑی دیر کو جا بیٹھیں بنجاروں میں

عمر گزاری اس انداز سے جیسے موسم جاڑوں کا
دل میں دھوپ سے جی بہلا دیں رات کے انگاروں میں

خلوت غم میں بیٹھ رہیں، یہ ہو نہ سکا، توفیق نہ تھی
معنیٔ غم کیا سمجھا دو گے، ہم بھی ہیں دل افگاروں میں

کان ہی رکھتی ہیں تو عجب کیا، بول پڑیں تو آفت ہے
تم کو خبر کیا، کتنے پیکر جذب ہیں ان دیواروں میں

خوابوں کی یہ راہ بھی دل پر بند ہوئی، کیا کیجئے گا
کل تک شاعر کہہ لیتے تھے، بس کر رہتے تاروں میں

مسکن تو اچھا ڈھونڈھا ہے، لیکن دونوں ہیں نادان
پلکوں میں راتیں آ بیٹھیں، نیندیں بیٹھیں غاروں میں

دولت کو ہم ٹھکراتے ہیں، دولت سے محروم نہیں
کتنے بھولے ہو کہ ہمیں تم گنتے ہو ناداروں میں

حرمت صاحب! اپنی شرافت پر اترانا چھوڑو بھی
یہ کھوٹا سکہ ہے اس کی قدر کہاں بازاروں میں!

---

[1] چند روزہ ہماری زبان، علی گڑھ یکم مارچ ۱۹۵۶ء

[2] نئی زندگی الہ آباد فروری ۱۹۴۸ء

فسادات میں مولانا ابوالکلام آزاد کی توجہ سے دہلی میں انجمن کے دفتر اور کتب خانے کی جو تحفظ عمل میں آیا، لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ مولوی عبدالحق نے ایک طویل مدت تک انجمن کے ذریعہ زبان و ادب کی جو خدمت کی اور انجمن کی تعمیر و ترقی کے سلسلے میں جو قربانیاں دیں ان کا اعتراف یا سرسری سا ذکر بھی اس کتابچے میں نہیں کیا گیا ہے۔ ہاں جہاں چند دوسرے معتمدین کا نام آیا ہے وہاں مجبوراً مولوی عبدالحق کا نام بھی تحریر میں آ گیا ہے اور بس۔ قاضی صاحب کے اس برتاؤ کے بین السطور دیکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ وہ انجمن کے سلسلے میں بھی عبدالحق کی خدمات کا ذکر کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔

مولوی عبدالحق مرحوم کے یہاں بھی قاضی صاحب مرحوم کا ذکر کچھ خوش گوار یا پسندیدہ الفاظ و انداز میں نہیں ملتا ہے۔ مثلاً تقسیم دہلی کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کی قیام گاہ پر دونوں حضرات کا آمنا سامنا ہو گیا، اس کا ذکر مولوی صاحب ہی کے قلم سے سنئے لکھتے ہیں۔

"آج ہم چاء پی رہے تھے تو دفعتاً قاضی عبدالغفار نازل ہوئے اور چاء میں شریک ہوئے، رفیق اور بشیر سے کچھ علیک سلیک ہوئی۔ وہ بھی مولانا کے مہمان ہیں ...... یہ مکان بہت چھوٹا ہے اور مہمانوں کے لئے صرف ایک ہی کمرہ ہے۔ اس میں ہم تین اور ایک اور صاحب ٹھہرے ہوئے ہیں۔ قاضی صاحب نے انجمن خاں سے کہا کہ میں ان کے ساتھ نہ ٹھہروں گا؟"[1]

مولوی عبدالحق مرحوم جیسا کہ سطور بالا میں عرض کیا گیا، ایک زمانے میں قاضی صاحب مرحوم کے نوزائیدہ اخبار "پیام" کے سرپرست اور معاون و مددگار تھے کس بنا پر قاضی صاحب ایسی شدید مخالفت پر آمادہ ہوئے، یا خود قاضی صاحب مولوی صاحب سے اس قدر برگشتہ کن حالات کی وجہ سے ہوئے، اس سلسلے میں جب تک کسی اور مستند اور معتبر ذریعہ سے اصل صورت حال سامنے نہ آئے حرف آخر کے طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اختلاف محض ذاتی تھا یا نظریاتی!

(یہ واقعہ ہے کہ مولوی عبدالحق نے شروع میں قاضی عبدالغفار صاحب کی بڑی مدد کی اور "پیام" کے اجرا میں بھی ان کا ہاتھ تھا۔ مولوی صاحب اور قاضی صاحب کے اختلافات کی ایک وجہ یہ تھی کہ ۱۹۳۶ء کے بعد مولوی صاحب اردو کی مہم کے سلسلے میں مسلم لیگ کے لیڈروں کی طرف جھکتے گئے تھے۔ قاضی صاحب آخر تک قوم پرست رہے۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اختلافات کی نوعیت صرف ذاتی نہیں بلکہ نظریاتی بھی تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ ۱۹۴۴ء میں جو اردو کانگریس حیدرآباد میں ہوئی اس میں قاضی صاحب ڈاکٹر زور کے ساتھ تھے اور ان کی کوشش یہ تھی کہ انجمن کو جو گرانقدر امداد حیدرآباد سے ملتی تھی وہ اردو کانگریس کو ملے جو انجمن اور ادارہ ادبیات اردو اور دوسرے اداروں کا ایک فیڈریشن ہو۔ یہ کوشش غلام محمد صاحب کی وجہ سے ناکام رہی۔ جب مرزا اسمٰعیل صدر اعظم ہوئے تو قاضی صاحب اس زمانے میں حیدرآباد کی حکومت کی پبلسٹی کر رہے تھے۔ انھوں نے انجمن کے متعلق اور مولوی عبدالحق کے خلاف ایک بیان بھی جاری کیا تھا اور لکھنؤ میں کچھ اردو دوستوں کی تائید بھی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ ترمیں نے قاضی صاحب کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔ میرے نزدیک ذاتی اختلافات سے زیادہ اس معاملے میں نظریاتی اختلافات کی اہمیت ہے جس کی وجہ سے ذاتی تعلقات پر بھی اثر پڑا۔

آل احمد سرور)

[1] مکتوبات عبدالحق۔ ص۴۹۹ (بنام ہاشمی فریدآبادی) مکتبہ اسلوب کراچی ۱۹۶۳

ہماری زبان

سے خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
منیجر

مراسلات

مردم شماری و محبان اردو کی ذمہ داری

محبان و ہمدردان اردو کو اخباروں کے ذریعہ سے معلوم ہوا ہوگا کہ اترپردیش کا ونسل میں بابو چھیدی لال ساتھی کی تجویز کہ اردو کو صوبہ کی دوسری سرکاری زبان قرار دیجائے ۱۸ مئی ۷۰ء کو اس بنا پر نامنظور کردی گئی کہ وزیر تعلیم نے فرمایا کہ صوبہ میں اردو بولنے والوں کی تعداد ۳۰ فیصدی نہیں ہے جس پر بموجب فیصلہ لسانی کمیشن یہ سہولت مل سکتی تھی البتہ انھوں نے یہ ضرور فرمایا کہ سوائے اس کے اردو کو ہر سہولت دیجائے گی و مراعات پر عملدرآمد کی کوشش کی جاویگی اور تمام شکائتیں دور کی جاویں گی۔

معلوم ہونا چاہئے کہ حد بندی کمیشن مذکورہ بالا کی رپورٹ پارلیمنٹ میں پیش ہونے و منظور ہونے کے بعد بہ مشورہ وزرائے اعلیٰ صوبجات ایک میمورنڈم لسانی اقلیتوں کی سہولت کے لئے ۱۹۵۶ء میں جاری ہوا اس میمورنڈم کو Govt of India memo-randum 1956 safeguards for linguistic minorities کہتے ہیں اس کے دفعہ ۸ حد بندی کمیشن کی رپورٹ کا مفہوم یہ بھی ہے کہ ۳۰ فیصدی کا فائدہ ضلع کو بھی مل سکتا ہے یو۔پی میں ایسے کئی ضلع آتے ہیں جہاں کی آبادی اردو کی ۳۰ فیصدی یا اس کے اوپر ہے۔ علاوہ اس کے اس کمیشن، میمورنڈم و چیف منسٹر کی کانفرنس کے فیصلہ ۱۹۶۱ء کی رو سے ۱۵ فیصدی پر جو فائدہ پہنچتا ہے وہ تو ملنا چاہئے تھا وہ بھی دس بارہ برس ہوئے کو دے نہیں دیا گیا جس کا ذکر نیچے ہے یہ اور دیگر مراعات پر اگر صحیح معنوں میں عمل ہوا ہوتا تو ۹۰ فیصدی شکائتیں خود بخود رفع ہو جاتیں۔ یوں تو سبھی لوگ جانتے ہیں کہ صوبہ میں زیادہ تر لوگ اردو ہی بولتے دیکھے ہیں اور ۸ اکتوبر ۴۷ء کے پہلے جس دن کہ کاونسل میں صوبہ کی زبان ہندی قرار دیگئی پورے صوبہ کی زبان اردو تھی اردو بھی زبان ایک وہاں نہ مٹی ہے نہ بگڑی ہے۔ علاوہ بریں ۱۹۳۸ء میں جب پہلے پہل کانگریس گورنمنٹ ملک میں بنی تو اس نے زبان کا ایک نقشہ تیار کرایا اس وقت ملک کے سات صوبوں کی زبان صرف اردو قرار دی گئی اور ان سات صوبوں کی بشمول اتر پردیش ۴ کروڑ ۱۱ لاکھ ۵۰ ہزار اردو بولنے والوں کی آبادی تھی اور بقیہ صوبوں میں ۵۰ فیصدی سے ۵۰ فیصدی تک لوگ اردو بولتے سمجھنے والے تھے اور ۲۲ برس بعد پورے ملک کی اردو آبادی دو کروڑ ۳۳ لاکھ ہوگئی۔ مردم شماری میں زبان کی بعض وقت جو درگت ہوتی ہے وہ ظاہر ہے۔ بابو شیو ناتھ پرشاد صدر انجمن ترقی اردو یو۔پی کی مادری زبان باوجود کہنے کے ہندی لکھی گئی جو بعد کو درست ہوئی رپورٹ گورنمنٹ تک پہنچی تحقیقات ہوئی افسر مردم شماری بنارس نے شمار کنندہ کو تنبیہ کی۔ عالی جناب پنڈت آنند نرائن ملا صاحب سابق جج ہائی کورٹ و نائب صدر انجمن ہند کی مادری زبان ہندی لکھی گئی جو بعد کو درست ہوئی اوروں کا کیا ذکر ہے جب بڑوں کی یہ حالت ہے۔ ہاں اس شکایت میں بہت کچھ کمی ہو سکتی ہے اگر شمار کنندہ گھر کے مالک کو ایک پرچہ بوقت مردم شماری دیوے کہ اس مکان میں اردو مادری زبان کے اتنے آدمی ہیں تو کسی شک کی گنجائش نہیں رہے گی۔ کمشنر مردم شماری ہند کی توجہ اس طرف مبذول کرائی جانی چاہئے۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری میں ۱۰ فیصدی سے زائد مسلمانوں نے اور ۴ فیصدی ہندو اصحاب نے اپنی مادری زبان ہندوستانی لکھائی یہ اردو والوں ہی کی تھی جو اردو میں جوڑا نہیں گیا ورنہ پورے صوبہ کی اردو آبادی ۱۷ فیصدی کے اوپر ہو جاتی اور ۱۵ فیصدی پر ملنے والے سب مراعات کے مستحق پورے صوبہ کے اردو والے ہوتے اردو لکھانے والے ۴۲۵۰۰۳۴ ہندوستانی لکھانے والے ۶۷۴۴۹۳۸ تھے۔ اب ۱۵ فیصدی پر ملنے والے مراعات ملاحظہ فرماویں۔ مطابق کمیشن و میمورنڈم مذکورہ و فیصلہ چیف منسٹرس ۱۹۶۱ء کی رو سے جس ضلع میونسپلٹی، تحصیل یا تعلقہ کی اردو آبادی ۱۵ فیصدی ہو تو وہاں ووٹر فہرست، راشن کارڈ، نوٹس، اشتہار، ایجنڈا وغیرہ سب اردو میں بھی چھپنا چاہئے اگر کسی تعداد سے کوئی چیز نامنظور ہوتی ہے تو منظور والی تعداد کا تو فائدہ ضرور سے پہنچانا چاہئے۔ ضرور سے یہ بھی نہیں کیا گیا ۱۹۵۱ء کی مردم شماری سے ۲۴ ضلع کے مقامات اس میں آتے ہیں۔ بنارس شہر کی آبادی ۱۷ فیصدی ہے ووٹر فہرست کے لئے ۱۹۶۱ء سے لکھا جا رہا ہے دو مرتبہ درخواست خارج ہوئی کہ پورے ضلع کی آبادی ۱۵ فیصدی نہیں ہے حالانکہ بموجب قاعدہ یہ ہو سکتا تھا مگر ووٹر فہرست اردو میں نہیں چھپی اتنا ضرور ہوا کہ میری درخواست پر اگست ۶۷ء میں حکم ہوا کہ ضلع کے سطح کے نیچے اس کا نفاذ کیا جاوے یہی رپورٹ کمیشن وغیرہ میں تھا۔ البتہ ۶۵ء میں ۹ ضلع کے لئے اب حکم جاری ہوا معلوم نہیں ووٹر لسٹ چھپی یا نہیں۔ ۵۱ء کے مقابلہ میں ۶۱ء میں تین فیصدی سے زائد اردو بولنے والوں کا اضافہ ہوا افسوس و تعجب تو یہ ہے کہ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کا BREAK FIGURE ابتک OUT نہیں ہوا۔ تاکہ دیکھا جاتا کہ اور کتنے مقامات ۱۹۶۱ء میں بڑھے ہیں اور ۱۹۷۱ء کی مردم شماری سر پر ہے کتنے دخل میں کتنا فرق ہے۔ جنگ آزادی میں ہر موڑ پر اس زبان نے اہم رول ادا کیا ہے۔ مہاتما جی کی بات بھلا دی گئی ہے۔ ۲۲ برس سے کہا جا رہا ہے کہ اردو کو سب سہولت دی جاویگی اس بار بھی کہا گیا ہے دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ ہم لوگوں نے ۷۰ء کو درخواست از پیل وزیر اعلیٰ و وزیر تعلیم و وزیر لوکل سلف گورنمنٹ صاحبان کی خدمت میں شکایتوں کے ازالہ کے لئے بھیجی ہے دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ جب مادری زبان،

اتنی اہمیت ہے تو محبان اردو کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ مردم شماری کے وقت اپنی مادری زبان اردو لکھائیں اور اس کے لئے اپنی اپنی جگہ کوشش کریں اگر صوبہ میں اردو آبادی ۳۰ فیصدی ہوگی تو یہ صوبہ دو زبانی صوبہ قرار دیا جائے گا اور اس سہولت کے مانگنے کے اردو والے کم سے کم حقدار ہو جائیں گے۔ امید ہے محبان اردو اس طرف خاص توجہ دیں گے اور کمشنر صاحب مردم شماری کو وہی لکھیں گے جیسا اوپر لکھا گیا ہے۔

بہار میں • دانا رسول سکریٹری

اردو کی وکالت اور اعتذار پسندی

اکثر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اردو کی حمایت میں لب کشائی کرتے وقت ان باتوں پر زور دیا جاتا ہے کہ یہ صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے، یہ بہت میٹھی اور شیریں زبان ہے، وغیرہ یہ اعتذار پسندی اچھی نہیں۔ اگر اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہو تو کیا سیکولر ہندوستان میں اس کو پنپنے کا حق نہیں ملے گا؟ اگر اردو ایک کھٹی اور کڑوی زبان ہو تو کیا اس کو ترقی کے مواقع نہیں دئے جائیں گے؟ اور پھر زبان کا میٹھا اور کڑوا ہونا تو ایک عجیب سی بات ہے۔ ہر زبان کے اپنے اصوات ہوتے ہیں۔

تو عرض کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اردو زبان کو دستور ہند میں تسلیم کیا جا چکا ہے اور اس کے بولنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اور اس کی وکالت کے لئے اتنی ہی بات کافی ہے۔ بس!

• اقبال کرشن

مطبوعاتِ انجمن

۱۔ ادبی اور قومی تذکرے (حصہ دوم)	پنڈت کشن پرشاد کول	۴ر۵۰
۲۔ اردو ساہتیہ کا اتہاس (ہندی)	سید احتشام حسین	۷ر۲۵
۳۔ اردو صرف نحو (جدید ایڈیشن)	مولوی عبدالحق	۱ر۲۵
۴۔ اردو ہندی لغت	مرتبہ انجمن ترقی اردو	۴ر۰۰
۵۔ اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ	ڈاکٹر محمد عزیز	۵ر۵۰
۶۔ اطلاقی صاجیات	ڈاکٹر جعفر حسن	۴ر۵۰
۷۔ الایام (اردو ترجمہ)	ڈاکٹر طٰہٰ حسین / مترجم سید عبدالباقی شطاری	۴ر۰۰
۸۔ انتخاب شرح دیوان مومن	حامد حسن قادری	۳ر۵۰
۹۔ انتخاب کلام میر	مولوی عبدالحق	۴ر۵۰
۱۰۔ انجم کدہ	عزیز لکھنوی	//
۱۱۔ انواع فلسفہ	ظفر حسین خاں	۵ر۵۰
۱۲۔ آئینۂ حقیقت	پنڈت حبیب الرحمٰن شاستری	۲ر۰۰
۱۳۔ ایک مشرقی کتب خانہ	سید مبارز الدین رفعت	۳ر۰۰
۱۵۔ باپو کے قدموں میں (مکمل)	ڈاکٹر راجندر پرشاد	۱۵ر۰۰
۱۶۔ بازدید	منیب الرحمٰن	۳ر۵۰
۱۷۔ بچوں کے ادب کی خصوصیات	مشیر فاطمہ	۱ر۰۰
۱۸۔ بھگوت گیتا	محمد اجمل خاں	۲ر۵۰
۱۹۔ پرچھائیں	آصف علی	۴ر۰۰
۲۰۔ تاریخ جمالیات	مجنوں گورکھپوری	۲ر۰۰
۲۱۔ تذکرہ گلشن سخن	مسعود حسین رضوی	۲ر۰۰
۲۲۔ تذکرہ شعرائے جے پور	احترام الدین احمد شاغل	۱۲ر۵۰
۲۳۔ تنقیدیں	ڈاکٹر خورشید الاسلام	۶ر۰۰
۲۴۔ چند ہم عصر	مولوی عبدالحق	۱ر۵۰
۲۵۔ حالی کی ایک جھلک	بیگم صالحہ عابد حسین	//
۲۶۔ حیات اجمل	قاضی عبدالغفار	۸ر۰۰
۲۷۔ خطوط غالب	مالک رام	۷ر۵۰
۲۸۔ دھمید	منور لکھنوی	۴ر۰۰
۲۹۔ دیمک کی کہانی	ڈاکٹر عبدالبصیر خاں	۲ر۰۰
۳۰۔ روزگار شرح سود اور زر	ابو سالم	۵ر۵۰
۳۱۔ زنداں نامہ	فیض احمد فیض	۲ر۲۵
۳۲۔ سخن مختصر (مجموعۂ کلام)	معین احسن جذبی	۲ر۰۰
۳۳۔ سن ستاون	پنڈت سندر لال	۴ر۰۰
۳۴۔ سیاسیات کے اصول (مکمل)	ہارون خاں شروانی	۵ر۰۰
۳۵۔ سیر افلاک	حکیم احمد	//
۳۶۔ شادی کہانی شادی کی زبانی	محمد مسلم	//
۳۷۔ سوگوار یاد	رحم علی الہاشمی	۲ر۲۵
۳۸۔ شکنتلا (اردو)	بیگم قدسیہ زیدی	۲ر۰۰
۳۹۔ " (ہندی)	"	//
۴۰۔ شوپنہار	مجنوں گورکھپوری	۱ر۵۰
۴۱۔ ظاہر و باطن	محمد فضل الرحمٰن	۱ر۲۵
۴۲۔ غالب ایک مطالعہ	ڈاکٹر خورشید الاسلام	۶ر۰۰
۴۳۔ فرانسیسی ادب	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۴ر۰۰
۴۴۔ تین مغربی ڈرامے	مجنوں گورکھپوری	۷ر۰۰
۴۵۔ خواب شیریں	جے کرشن چودھری	۲ر۰۰

انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ

انجمن کی خبریں

اردو طلبہ کے لئے اردو کی نصابی کتابوں کی فراہمی کا مسئلہ

دہلی:- توقع ہے کہ دہلی میں چھٹی ساتویں اور آٹھویں جماعت کے ان طالب علموں کو جن کی مادری زبان اردو ہے نصاب کی اردو کتابیں موجودہ تعلیمی سال کے وسط میں اگر دفتری کارروائی میں تاخیر ہوئی تو آئندہ تعلیمی سال کے شروع میں دستیاب ہو سکیں گی۔

انجمن ترقی اردو دہلی اسٹیٹ کے ایک وفد اور محکمہ تعلیم کے جائنٹ ڈائرکٹر جناب دانچو کے درمیان ملاقات سے یہ بات معلوم ہوئی۔

بات چیت نصف گھنٹہ تک جاری رہی اور اراکین وفد میں انجمن ترقی اردو دہلی اسٹیٹ کے جائنٹ سکریٹری جناب بہار برنی آنریری سکریٹری جناب ظفر ادیب اور انجمن کی تعلیمی کمیٹی کے اراکین جناب سلیمان صابر اور جناب محمد یوسف شامل تھے یاد رہے کہ موسم گرما کی تعطیلات میں انجمن کی طرف سے اس کی تعلیمی کمیٹی نے ایک مطالبہ نامہ پیش کیا تھا جس میں اور باتوں کے علاوہ اردو کی نصابی کتابوں کی فراہمی کا مطالبہ شامل تھا اس دوران انجمن کے مذکورہ وفد نے اپنی کوششوں کو جاری رکھا۔ انجمن کی تعلیمی کمیٹی کی طرف سے فزکس، کیمسٹری، بائیولوجی اور کامرس وارتھینک جیسے مضامین کی اردو ٹیکنیکل اصطلاحات جلد ہی محکمہ تعلیم کے حوالے کر دی جائیں گی۔

جناب دانچو نے ان کتابوں کے سلسلہ میں انجمن سے مدد چاہی اور وفد نے انجمن کی طرف سے پوری مدد اور خدمت کا یقین دلایا جائنٹ ڈائرکٹر صاحب نے قیمتوں کے بارے میں بھی تفصیلی گفتگو کی ہندی اور انگریزی کی جو کتابیں اس وقت چھپی ہیں ان کی قیمت کم ہے مثلاً فزکس ۱۹۴ صفحہ کی کتاب کی قیمت پچاس پیسہ ہے۔

دانچو صاحب نے تسلیم کیا کہ اردو کتابوں کی قیمت اس قدر کم نہیں ہو سکتی تاہم انھوں نے کہا کہ یہ قیمت صرف لاگت کی تقسیم سے بنی چاہئے تاکہ والدین کو بوجھ محسوس نہ ہو۔

جناب دانچو نے انجمن کی مساعی کو بہ نظر تحسین دیکھا اور امید ظاہر کی کہ اردو کتابوں کے چھپنے کے بعد وہ سندھی وغیرہ میں بھی کتابوں کا انتظام کر سکیں گے۔

ملاقات کے آخر میں جناب بہار برنی نے جناب دانچو صاحب کو اردو اسکولوں میں متعین اردو نہ جاننے والے ٹیچروں کی جگہ اردو ٹیچروں کے تقرر کی طرف توجہ دلائی جسے اصولی طور پر جناب دانچو صاحب نے مان لیا اور کہا کہ انجمن اس سلسلے میں انھیں اعداد و شمار فراہم کرے۔ جناب یوسف صاحب نے تجویز کیا کہ بیاڑی وغیرہ سے نئے اسکولوں میں اردو کی ایک شفٹ کی جائے اور چشمہ بلڈنگ کو مکمل طور پر اردو ذریعہ تعلیم کا اسکول بنایا جائے جناب دانچو صاحب نے اس سلسلے میں وفد کو ضلع نمبر ۲ کے ڈپٹی ڈائرکٹر تعلیم سے ملنے کا مشورہ دیا۔

• الجمعیۃ

جنگاؤں میں اردو مدارس کی ضرورت

جنگاؤں:- جناب محمد محبوب خاں معتمد انجمن ترقی اردو نے اپنے ایک بیان میں اس بات پر سخت تشویش و تردد کا اظہار کیا ہے کہ جنگاؤں پنچایت سمیتی نے مستقر اور اطراف و اکناف کے علاقوں میں اردو جماعتوں اور اس کے قیام سے متعلق متعدد نمائندگیوں پر بھی ابھی تک کوئی توجہ نہیں کی ہے۔

انھوں نے کہا کہ اکثر مقامات پر اردو مادری زبان والے طلبہ کی کثیر تعداد موجود ہے لیکن اردو ذریعہ تعلیم کی زائد اردو جماعتوں اور مدارس کھولنے کی ضرورت کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے اردو سے متعلق ریاستی حکومت کی منصفانہ پالیسی کو پنچایت سمیتی کی طرف سے روبعمل لانے کا مطالبہ کرتے ہوئے صدر پنچایت سمیتی اور ڈی ای او ورنگل سے اس سلسلہ میں فوری کارروائی کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔

• رہنمائے دکن

ایم۔ اے۔ شمیم (مہروچی)

احساس

اے دلِ مضطرب ٹھہر بھی جا!
داستاں کون تیری سنے گا
کون جانے ہے سوزِ دردِ دل کیا
یہ نگر پتھروں کا نگر ہے
ہے یہاں نام جس شے کا انساں
وہ ہے اک جسم بے روح و بے جاں
بے حسی اس نگر کا ہے ایماں
یہ نگر پتھروں کا نگر ہے
اجنبیت یہاں ڈس رہی ہے
آدمی دشمنِ آدمی ہے
دوستی نام کی دوستی ہے
یہ نگر پتھروں کا نگر ہے
یا تو پھر خون کے گھونٹ پی لو
یا کہ ٹکرا دو خود اپنے سر کو
اپنے جذبات کا قتل کر دو
یہ نگر پتھروں کا نگر ہے
زندگی تو بھٹکتی رہے گی!
اے دلِ مضطرب! آہ کیوں کی
لوٹ آئے گی آواز تیری سی
یہ نگر پتھروں کا نگر ہے!

اخبار و اذکار

رانچی یونی ورسٹی میں موجودہ ادبی مسائل پر دو روزہ سیمینار

بزم ادب (شعبۂ اردو) رانچی یونی ورسٹی کے سالانہ جلسے کے موقع پر موجودہ ادبی مسائل پر ایک دو روزہ سیمینار منعقد ہوا۔ اس سیمینار کی صدارت شعبۂ اردو بہار یونی ورسٹی کے صدر جناب پروفیسر اختر قادری نے فرمائی۔

ابتدا میں جناب ابو ذر عثمانی نے سیمینار کے انعقاد کی غرض و غایت اور اس کی اہمیت و افادیت پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی۔ انھوں نے بتایا کہ اس سیمینار کے انعقاد کا اصل مقصد ادب میں اقدار و معیار کے مسئلہ کی توضیح اور ادب کے منصب و مقصد کے از سر نو تعین پر غور کرنا ہے جو موجودہ ادبی کشمکش کے ماحول میں ناگزیر ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر جے۔ رام جلیب وائس چانسلر رانچی یونی ورسٹی نے اپنی افتتاحی تقریر میں ادب کے عمومی مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے ادبی اظہار کے کچھ اہم نکتوں کی نشاندہی کی۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان و ادب کا وہ امتیاز ہے کہ اس میں نئے متنوع اور رنگا رنگ خیالات و افکار کے اظہار کی پوری صلاحیت ہے اس لحاظ سے یہ سیمینار جس میں جدید ادبی مسائل پر غور و خوض کیا جا رہا ہے بڑی اہمیت کا حامل ہے اور اس کے یقیناً خوش آئند نتائج برآمد ہوں گے۔

اس نشست میں علی الترتیب تین مقالے پیش کئے گئے "ادب و تہذیب کا رشتہ" (نجم الہدیٰ لکچرار شعبۂ اردو بہار یونی ورسٹی) "جدید ادبی مسائل" (عبد المغنی لکچرار شعبۂ انگریزی پٹنہ یونی ورسٹی) "ادب کا منصب" (ڈاکٹر پی۔ ڈی۔ ودیارتھی لکچرار شعبۂ فلسفہ رانچی یونی ورسٹی)۔ جناب نجم الہدیٰ نے اپنے مقالے میں ادب کے تہذیبی منصب پر خاص زور دیا انھوں نے بتایا کہ ادب اور تہذیب کا رشتہ اس قدر واضح مستحکم اور مسلم ہے کہ اسے نظر انداز کر کے کسی طرح ادبی تجربات میں معنویت پیدا نہیں کی جا سکتی۔ آج کا ادب جو ہمارے لئے ناقابل فہم ہو گیا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اس میں ادب و تہذیب کے رشتے کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اس لئے ادبی اظہار کو واضح اقدار و معیار کے تابع کیا جائے۔

جناب عبد المغنی نے اپنے مقالے میں خاصی تفصیل اور وضاحت سے موجودہ ادبی مسائل اور رجحانات کا جائزہ لیا اور بتایا کہ موجودہ ادب کے اندر فکر و فن اور اخلاق و جمالیت کے درمیان وہ توازن مفقود ہو گیا ہے جس کی بنیاد ہی پر دراصل عظیم ادب کی تخلیق ہوتی ہے لہٰذا ادبی عظمت کے حصول کے لئے اس توازن کی بازیافت ناگزیر ہے انھوں نے اس مقالے میں مختلف اصناف ادب کے خصوصی مسائل سے بھی بحث کی اور بعض بڑے اہم اور فکر انگیز اشارے کئے۔ انھوں نے جدید شعری ہیئتوں اور تجربوں خصوصیت کے ساتھ نظم آزاد کے فنی جواز کا بھی سوال اٹھایا جو ان کے خیال میں ہمارے ادبی و تہذیبی مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی۔

ڈاکٹر پی۔ ڈی۔ ودیارتھی نے اپنا مقالہ انگریزی میں پیش کیا انھوں نے بتایا کہ ادب انسان کی اعلیٰ ترین روحانی کاوشوں کا مظہر ہے اور انسانی جذبات و احساسات کی تہذیب و ترتیب کا بہترین ذریعہ۔ ادب سے ہمیں جس طرح روحانی بصیرت، آفاقی شعور فکر و نظر کی وسعت اور انسان کے باطنی وجود کا ادراک حاصل ہوتا ہے کسی اور ذریعہ سے نہیں۔ یہ بڑی افسوسناک بات ہے کہ آج کا ادب اپنے روحانی اور تہذیبی منصب سے دور ہٹتا جا رہا ہے اور ایک میکانکی ذہنی عمل بن کر رہ گیا ہے جس سے ہمیں انسان کے باطنی وجود کا کوئی عرفان حاصل نہیں ہوتا۔

دوسری نشست کا آغاز جناب کرامت علی کرامت (ریڈر شعبۂ ریاضیات اتکل یونی ورسٹی اڑیسہ) کے مقالہ "جدید شاعری کا بحران" سے ہوا۔ مقالہ نگار نے جدید شاعری کو جدید انسان کی نفسیاتی پیچیدگیوں کا اظہار بتایا اور ان عوامل اور محرکات کی نشاندہی کی جو نئے شعری تجربوں، اسالیب اور ہیئتوں کے پیچھے کارفرما ہیں۔ انھوں نے جدید شاعری کے موضوعات اور اسالیب کا جائزہ لیتے ہوئے اس کا باضابطہ فنی مقام متعین کرنے کی کوشش کی اور یہ تسلیم کیا کہ جدید شاعری کے سارے حصے کو معیاری اور عمدہ شاعری قرار نہیں دیا جا سکتا انھوں نے جدید شاعری اور تجرباتی شاعری میں فرق کرنے پر بھی زور دیا۔ دوسرا مقالہ پروفیسر سید عبد الباری شبنم سبحانی (شعبۂ انگریزی فاربس کالج فیض آباد) نے پیش کیا جس میں انھوں نے جدیدیت اور اس کے مسائل پر خاصی تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے واضح کیا کہ جدیدیت کا رجحان آج جس شکل میں ہمارے ادب میں رائج ہے وہ مغرب کی فکری و ادبی تحریکوں کے نتیجے میں بروئے کار آیا ہے۔ جس کا ہماری تہذیبی اقدار اور مشرقی مسائل سے کوئی تعلق نہیں یہی وجہ ہے کہ یہ ادب ہمارے لئے جذباتی اپیل اور ذہنی نشاط کا کوئی سامان نہیں رکھتا۔

اس کے بعد جناب حبیب عثمانی نے اپنا طویل مقالہ "ادب میں اقدار و معیار کا مسئلہ" پیش کیا انھوں نے واضح کیا کہ جمالیات بلاشبہ ادب کی اہم ترین قدر ہے لیکن اس کے ساتھ ہی فکر و خیال کی اہمیت بھی مسلم ہے جس کے بغیر کوئی بڑا ادبی کارنامہ وجود میں نہیں آ سکتا۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ ادب میں نظریے اور عقیدے کی اہمیت بالکل واضح ہے لیکن جب تک یہ چیز جذبے کی شکل میں بروئے کار نہ آئے اس کی ادب ہی نہیں زندگی میں بھی کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد جدید ادب اور اس کے مسائل پر تین اور مقالے پیش کئے گئے۔ پروفیسر سمیع الحق نے اپنے مقالے "موجودہ ادبی مسائل" میں موجودہ ادب کے بحران کو ایک غیر حقیقی کرب و بلا کا نتیجہ قرار دیا جس کا ہماری تہذیب اور معاشرے میں کوئی سراغ نہیں ملتا۔ انھوں نے اس بات پر

زور دیا کہ ادیب کا فن واضح شعوری مقاصد کے تابع ہونا چاہیے جس کے بغیر اس کی تخلیقات میں معنویت نہیں پیدا ہو سکتی۔

جناب احمد سجاد نے اپنے مقالے جدیدیت ایک مطالعہ میں جدیدیت کو ایک منفی رد قرار دیا جس نے ادب کو ایک معمہ اور گورکھ دھندا بنا دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جدید شعرا اور فنکاروں کی اکثریت جس قسم کے تجربے کر رہی ہے وہ مہذب فنی اظہار کے تقاضوں کے منافی ہیں۔ جدید شعرا اور فنکاروں کی اصل خامی یہ ہے کہ ان کے یہاں مثبت انداز نظر مفقود اور فنی تناسب و توازن ناپید ہے۔

ڈاکٹر نثار مصطفٰے نے اپنے موجودہ ادبی مسائل میں بتایا کہ ادب میں زمانہ کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ نئے موضوعات و مسائل ہمیشہ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ چیز ایک روایتی تسلسل کی شکل میں بروئے کار آتی ہے اور آنی چاہیے۔ اس لئے کسی دور کے ادب کو تمام تر جدید قرار دینا بے معنی سی بات ہے۔

جناب ابوذر عثمانی شعبۂ اردو رانچی نے اپنے مقالے میں ادب و تنقید کے رشتے کی مختلف پہلوؤں سے وضاحت کی اور بتایا کہ ادبی تخلیق کا عمل خاصا پیچیدہ اور مرکب ہوتا ہے جسے محض اظہار ذات کی کوشش سے تعبیر کرنا صحیح نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے تنقید کے ایک ایسے جامع نظریے کی تشکیل پر زور دیا جس سے ادبی اقدار کا واضح تعین ہو سکے اور ادب کے معروضی، منصفانہ اور کلی مطالعہ میں مدد مل سکے۔

جناب مظفر اقبال لکچرار شعبۂ اردو بھاگلپور یونیورسٹی نے اپنے مقالے "ادبی تحقیق ایک مستقل فن" میں ادب کے مطالعہ میں تحقیق کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔

آخر میں جناب پروفیسر اختر قادری نے اپنا مبسوط مقالہ پیش کیا جس میں آپ نے اردو شاعری کے فکری و فنی مسائل کا واضح تاریخی پس منظر میں جائزہ لیا آپ نے روایت اور تجربے کے تعلق پر خاص زور دیا اور فرمایا کہ ادب میں تجربے اصلاح اور ترمیم کا عمل بظاہر کوئی نئی چیز نہیں لیکن اس کا لحاظ ضروری ہے کہ یہ عمل روایت کی توسیع کی شکل میں بروئے کار آنے ورنہ اس کی حقیقی افادیت اور معنویت اجاگر نہیں ہو سکتی۔

اس نشست میں جو مقالے پڑھے گئے ان پر آخر میں جدید ہندی ادب کے معروف ناقد اور شعبۂ ہندی رانچی کالج کے استاد پروفیسر ناگیشور لال نے ایک اجمالی تبصرہ کیا۔ اس کے بعد ایک باضابطہ ادبی منشور پیش کیا گیا جس میں ادب کے مقصد و منصب کا واضح تعین کیا گیا۔

سیمینار کا ایک شعبہ اردو کے تعلیمی و تدریسی مسائل پر بحث کے لئے مخصوص تھا اس سلسلے کی آخری نشست ۴ بجے شام میں جناب کرامت علی کرامت کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس نشست میں پروفیسر احمد سجاد، پروفیسر عقیل اشرف اور عبدالرؤف قاسمی صاحبان نے اپنے مقالے پیش کئے۔ پروفیسر احمد سجاد کا مقالہ خصوصیت کے ساتھ موضوع بحث رہا اور کافی پسند کیا گیا۔

شام کو مشہور طنز نگار جناب رضا نقوی واہی کی صدارت میں ایک مشاعرہ ہوا۔ جس میں مقامی اور غیر مقامی ممتاز شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔ • ابوذر عثمانی

ادبی منشور

شعبۂ اردو رانچی کالج رانچی یونیورسٹی کے زیر اہتمام مورخہ ۵ و ۶ اپریل ۷۰ء کو موجودہ ادبی مسائل پر ایک خصوصی سیمینار منعقد ہوا یہ منشور اسی موقع پر مرتب کیا گیا اور سیمینار میں شریک ہونے والے تمام نمائندہ ادیبوں کے اتفاق رائے سے منظور کیا گیا۔

ادب فنون لطیفہ کی اعلیٰ ترین شکل ہے۔ انسانی افکار و خیالات کی تہذیب و ترتیب میں اس کا رول عظیم ترین ہے ادب کے بغیر مہذب انسانیت کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ثقافت کی تمام قدروں کی پرورش، اظہار اور ارتقاء کا کام ادب ہی اپنے مختلف اسالیب و اصناف کے ذریعہ کرتا ہے۔ اس طرح ادب تاریخ انسانی کی تمام کد و کاوش اور جد و جہد میں انسان کا سب سے بڑا اسلحہ اور وسیلہ رہا ہے اس حقیقت کے پیش نظر ادب کی سنجیدگی اور ذمہ داری اس کے بنیادی لوازم اور خصائص قرار پاتے ہیں۔

ادب کی ہیئت دو عناصر سے مرکب ہوتی ہے۔ ایک فکر دوسرے فن۔ یہ دونوں عناصر ادبی تشکیل کے لئے یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ تخلیقی عمل کے اندر ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسرے پر کسی قسم کی فوقیت اور ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ لہٰذا ادب کی زندگی اور ترقی کے لئے ناگزیر ہے کہ فکر اور فن کے درمیان کامل اعتدال اور توازن ہو، اس میں ایک طرف فکر کی استقامت ہو تو دوسری طرف فن کی جمالیت، دونوں ایک دوسرے کے بالکل برابر، بلکہ ایک دوسرے

میں اس درجہ پیوست کہ من و تو کا کوئی فرق نہ رہے۔ یہ ادبی عمل اپنے قاری کو بیک وقت مسرت اور بصیرت، نشاط اور دانش، آرزو اور کاوش کا سامان فراہم کرے۔ اس کے ذریعہ احساسات کی ترویج جذبات کی ترتیب، خیالات کی تعین اور افکار کی تنظیم میسر آئے۔

لیکن آج ہمارے ادب میں اجتماعیت اور انفرادیت کے جداگانہ اور مبالغہ آمیز تصورات پر مبنی انتہا پسندیاں پیدا ہو گئی ہیں جن کے نتیجے میں ادب کے اندر عدم توازن، بے اعتدالی، انتشار اور پراگندگی کا دور دورہ ہے۔ یہ صورت حال تشویشناک اور خطرناک ہے۔ اس سے ادب، تہذیب اور انسانیت کی تمام اعلیٰ قدریں خطرے میں پڑ گئی ہیں۔ ادب پر نہ تو ریاست کی سیاسی جبریت مفید ہے اور نہ فرد کی مریضانہ بوالہوسی کے حملے اور نہ فرقہ پرستانہ مذہبیت کی یورش۔ ادب یقیناً معاشرے کا خادم ہے۔ لیکن یہ ایک آزاد اور مستقل بالذات ادارہ ہے۔ ادیب کو شعور، ذوق اور ضمیر کی کامل آزادی ہونی چاہیے، تاکہ وہ اپنے شعور و ذوق و ضمیر کے مطابق تہذیب و ثقافت کے استحکام اور فروغ کا سامان کرے۔

لہٰذا ہم ادبا و شعرا و دانشور ادب کے ہر انتہا پسند تصور کو یکسر رد کرتے ہیں۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ ادب سیاست، مذہبیت اور جنسیت کی الجھنوں کا پرستار نہیں، یہ ایک واضح اور روشن راستہ ہے ہر قسم کی الجھنوں کی تطہیر اور ترفع کا، اس کے ذریعہ انفس و آفاق کے معموں کو سمجھا اور سلجھا سکتے ہیں۔ ادب کا عمل منفی اور تخریبی نہیں، مثبت اور تعمیری ہے۔ یہ وسیع ترین معنوں میں انسان کی اخلاقی حسن اور حسن جمال دونوں کا مرکب ترجمان ہے۔ یہ عمیق ترین معنوں میں انسان کی جبلتوں کو نکھارنے اور سنوارنے کا ایک موثر وسیلہ ہے۔ ادب ہی انسان کی اندرونی دنیا میں ایک حسین و جمیل توازن پیدا کرتا ہے۔

لہٰذا ہم ادبا و شعرا اپنے رفیقان فن سے اپیل کرتے ہیں کہ انسانی تہذیب و معاشرے میں ادب کے اس متوازن اور تعمیری رول کو وہ پوری طرح سمجھیں اور اپنی تخلیقات کے ذریعہ پیش کریں۔ اس سلسلہ میں انھیں اپنی ذات کے نہاں خانوں اور جماعتی اور گروہی حصاروں سے باہر آنا ہوگا تاکہ وہ اپنے زمانے اور سرزمین کے احوال و کوائف پر اثر انداز ہو کر اپنے معاشرے میں ادب کی عظمت کو اجاگر کر سکیں۔

دستخط

اختر اورینوی، اختر قادری، رضا نقوی واہی، عبد المغنی، کرامت علی کرامت، مظفر شباب، سید عبد الباری، شبنم سبحانی، طیب عثمانی، پرکاش فکری، وہاب دانش، ناگیشور لال، ایچ۔ ان سانیال، سمیع الحق نجم، احمد سجاد، ابوذر عثمانی، مظفر اقبال، سہیل احمد، تسنیم جنیدی، قیصر صدیقی عالم، نثار مصطفیٰ، نہال احمد، ضیاء الانجم، اسلم پرویز، قمر حمید، جالب دہلی۔

اردو ہندوستان کی زبان ہے

حیدرآباد:۔ مرکزی وزیر تعلیم ڈاکٹر وی کے آر وی راؤ نے کہا کہ اردو ایک ہندوستانی زبان ہے اور دوسری قومی زبانوں کے ساتھ اردو زبان کو بھی ترقی دی جائے انھوں نے اس ذہنیت کی مذمت کی جو اردو کو کسی خاص فرقہ یا مذہب والوں کی زبان قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر راؤ اردو کتابیں فروخت کے لئے جاری کرتے ہوئے تقریر کر رہے تھے۔

• الجمعیۃ

جوش ملیح آبادی بھی پاکستان میں اردو کے مستقبل سے مایوس

نئی دہلی:۔ اردو کے مشہور شاعر جوش ملیح آبادی نے کراچی میں اپنے اعزاز میں منعقد ایک جلسہ میں کہا کہ انھیں انتہائی افسوس کے ساتھ اس بات کا یقین ہو چکا ہے کہ پاکستان میں اردو کا مستقبل انتہائی تاریک ہے جوش ملیح آبادی نے کہا کہ گذشتہ دو ماہ میں اردو کے سلسلے میں ظاہر کئے گئے خیالات کی بنا پر انھوں نے یہ تاثر حاصل کیا ہے کہ پاکستان کے کسی بھی حصہ میں اردو کا کوئی بھی مقام نہیں ہوگا مشرقی پاکستان میں پہلے ہی اردو کو کسی قانونی درجہ سے محروم کر دیا گیا ہے لیکن اب مغربی پاکستان کے بھی بہت سے حصوں سے اسے نکال دیا جائے گا۔ آپ نے کہا کہ مغربی پاکستان میں جو نئے صوبے بنائے گئے ہیں وہاں پشتو، بلوچی، سندھی اور پنجابی زبانوں کو سرکاری درجہ دینے کا مطالبہ زور پکڑ گیا ہے اگر ایسا ہوا تو اردو کہاں جائے گی جوش صاحب نے اس بات پر بھی افسوس ظاہر کیا کہ پاکستان میں جو عام انتخابات ہونے جا رہے ہیں انھیں ابھی علاقائی بنانے کا پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے آپ نے کہا کہ اردو کو ہندوستان سے پہلے ہی دیس نکالا مل چکا ہے اور اب پاکستان میں بھی اسے کوئی پوچھ نہیں رہا۔

یاد رہے کہ جوش ملیح آبادی نے سرکاری ماہنامہ آج کل کی ادارت چھوڑ کر ہندوستان سے پاکستان جاتے وقت اپنے ترک وطن کے جو اسباب بتائے تھے اس میں اردو کے مستقبل سے مایوسی بھی شامل تھی اب معلوم ہوتا ہے کہ وہ پاکستان میں بھی اردو کے مستقبل سے مایوس ہو گئے ہیں۔

• ریاست

شہر میں ادبی ادارے، مرکزی وزیر تعلیم کا معائنہ

حیدرآباد:۔ مرکزی وزیر تعلیم ڈاکٹر وی کے آر وی راؤ کو جناب حامد علی خاں شریک معتمد انجمن ترقی اردو جناب سرینواس لاہوٹی معتمد تنظیمی انجمن اور ڈاکٹر حسینی شاہد پرنسپل اردو آرٹس کالج نے انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے دفتر اردو ہال اور نیشنل کالج اور اردو آرٹس کالج اور ان کی زیر تعمیر عمارات کا معائنہ کروایا جس پر مرکزی وزیر نے خوشنودی کا اظہار کرتے ہوئے اردو کی ترقی کے لئے ممکنہ امداد و تعاون کا یقین دلایا۔

• نامہ نگار

تبصرہ

ڈاکٹر شمیم حنفی

• پریم چند: کہانی کا رہنما

• ڈاکٹر جعفر رضا • رام نرائن لال بینی مادھو پبلشرز، کٹرہ، الٰہ آباد۔

مسٹر آدک کے تاریخی انکشافات کی بات اور ہے کہ تاریخ ایک زمانے سے عام طور پر واقعات اور حقائق کے بجائے سیاسی مصالح اور تعصبات کی بنیاد پر لکھی جا رہی ہے۔ عبرت یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ ادب اور سیاست کے رشتوں اور فاصلوں کی تعیین کے باوجود ہمارے عہد میں ادبی مسائل نہ صرف نظریاتی سیاست بلکہ لسانی سیاست کے ایک مہلک اور مریضانہ رجحان کی زد پر ہیں۔ پریم چند کا مطالعہ کرتے وقت بعض غیر اردو داں حلقوں میں سب سے زیادہ زور اس بات پر صرف کیا جاتا ہے کہ پریم چند دراصل ہندی کے ادیب تھے اور یہی زبان ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کا پہلا وسیلہ بنی۔ اس وکالت کا سہرا بھی مسٹر آدک کے سر ہوتا تو کچھ کہنا فضول تھا لیکن افسوس یہ ہے کہ ہندی کے چند ایسے ممتاز ادیب بھی جن کی روشن خیالی، وسیع النظری اور (یادش بخیر) ترقی پسندی کی ایک زمانے میں قسمیں کھائی جاتی تھیں، وہ بھی اسی معصومانہ جذباتیت کے شکار نظر آتے ہیں۔ اس لحاظ سے جعفر رضا کا یہ کارنامہ قابلِ قدر ہے کہ انھوں نے کافی تلاش و تحقیق کے بعد پریم چند کی تمام کہانیوں کے سال لیے اور ان کی متعلقہ تفصیلات کی بنیاد پر یہ حقیقت بخوبی واضح کر دی ہے کہ پریم چند کی ادبی زندگی کا نصفِ اوّل سے زیادہ حصہ بنیادی طور پر ایک اردو ادیب کی حیثیت سے گذرا۔ پریم چند کی زندگی، ان کے سیاسی نظریے اور سماجی افکار کے باب میں بھی جعفر رضا نے جستجو اور دریافت کا ایک معتبر معیار پیش کیا ہے اور صرف مطبوعہ کتابوں یا مضامین سے قطع نظر پریم چند کے احباب، اعزا اور معاصرین کی ذاتی معلومات اور یادداشتوں سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ ماضی قریب یا زمانۂ حال کی ادبی شخصیتوں کے مطالعے میں اس قسم کی عصری شہادتوں سے متعدد مفید مطلب نتائج برآمد ہو سکتے ہیں جو بعد کے آنے والے ان محققین کی دسترس سے یقیناً باہر ہوتے ہیں جن کے ایمان اور گمان کا انحصار صرف علمی اور مطبوعہ ماخذ پر ہوتا ہے۔

اس کتاب کے مختلف ابواب میں پریم چند کے قصہ جات، کہانی کے فن، پریم چند کے سیاسی، سماجی اور فنی عقائد و تصورات اور پریم چند کی کہانیوں میں زبان و بیان کے مسائل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پریم چند کی زندگی اور ان کے سیاسی و سماجی نظریات کے بیان میں جعفر رضا کی یہ کتاب مطالعے اور تحقیق کے ہر معیار پر غالباً پوری اترے گی لیکن پریم چند کی تخلیقی شخصیت، کہانی کے فنی رموز اور پریم چند کی فنی استعداد کے تجزیے کی طرف مزید توجہ کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کے صفحات میں ایک پرخلوص، سادہ لوح، دردمند اور قوم پرست ہندوستانی کی تصویر تو ابھرتی ہے لیکن اس ادیب کے خد و خال دھندلے نظر آتے ہیں جس کی شخصیت ملکی اور تہذیبی مقاصد کی تابع ہونے کے باوجود تخلیقی سوز اور حرارت سے بھی معمور تھی۔ پریم چند کی تاریخی حیثیت مسلّم ہے لیکن ان کے بعد سے اب تک افسانے کا فن ارتقا کی کئی روشن اور پر اسرار منزلوں سے روشناس ہوا ہے۔ تجربوں کے تنوع نے افسانے کی ہیئت کے علاوہ اس کی باطنی فضا میں بھی نئے گوشوں کی نشاندہی کی ہے۔ اسی لئے پریم چند کے افسانوں کی فکری معنویت کا نئے زاویوں سے جائزہ لینے اور فن کے نئے تصورات کی روشنی میں ان کی قدر و قیمت کا از سر نو تعین کرنے کی ضرورت ہے۔ جعفر رضا نے اس پہلو کو بھی اپنے مطالعے میں شامل کر لیا ہوتا تو اس کتاب کی افادیت اور بڑھ جاتی۔

جعفر رضا الٰہ آباد یونیورسٹی میں اردو کے استاد ہیں۔ اردو اور ہندی دونوں زبانوں سے یکساں واقفیت رکھتے ہیں اور دونوں زبانوں کے ادب پر ان کی نظر گہری اور دور رس ہے۔ پریم چند کے مطالعے کی طرف اردو میں اب تک خاطر خواہ توجہ نہیں ہو سکی صرف ڈاکٹر قمر رئیس نے اس سلسلے میں قابلِ قدر کام کیا ہے۔ ہندی میں ان پر مقدار اور معیار ہر اعتبار سے بہت اچھا کام ہوا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ جعفر رضا نے اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں بکھرے ہوئے مواد کو سمیٹ کر اردو میں پریم چند پر اپنی قسم کا ایک بہت اہم اور لائقِ ستائش کام انجام دیا ہے۔ ان کی کتاب صاف ستھری چھپی ہے، سرورق دیدہ زیب ہے، کیا اچھا ہوتا اگر قیمت بھی دس روپے سے کم ہوتی۔

▲

ہماری زبان

کو مضامین و مراسلات ارسال کرتے وقت یہ خیال رکھیں کہ وہ کاغذ کے ایک طرف صاف لکھے ہوں۔

ادارہ

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین ایم۔ اے نے لیتھو کلر پریس علی گڑھ میں چھاپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا

REGD. NO. L. 422 فون نمبر ۲۹ R. NO. 2196/57